تصدیق
شمارہ ۰۷، جلد ۰۱، ۲۰۲۵

Article

The Horrors of War in the Short Stories of Ahmed Nadeem Qasmi

احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں جنگ کی ہولناکیاں

Dr. Fouzia Anjum
Principal, Govt. Associate College (w) 46G.B, Samundri, Faisalabad.
Correspondence: mahmilfatima45@gmail.com

ڈاکٹر فوزیہ انجم
پرنسپل گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج برائے خواتین ۴۶ گ ب، سمندری، فیصل آباد

eISSN: 2707-6229
pISSN: 2707-6210
Received:12-05-2025
Accepted:05-09-2025
Online:16-09-2025

CC BY

Copyright: © 2024 by the authors.

This is an open-access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

ABSTRACT

Ahmad Nadeem Qasmi was a humanistic author. He has variety of topics. In this article, horrors of war described in the short stories of Ahmad Nadeem Qasmi have been analyzed. Nadeem was desirous of peace. He strongly opposed war. He knew how painful the direct and indirect effects of war were. He felt this pain heartily. This very pain reflects in his short stories. Nadeem favored common man. He wishes to grant a sigh of relief to such suppressed people. His art faced evolutionary stages, but at every stage he wrote about humanity irrespective of colour, race and religion. He maintained the glory of literariness despite of purposefulness.

Ahmad Nadeem Qasmi, who left an indelible mark on Urdu literature and achieved great fame during his lifetime, spent nearly a century creating literature. As a humanistic writer and voice for humanity, he deeply felt the suffering of millions. He dedicated his life to fighting class exploitation with his pen. Qasmi's genius knew no bounds, and he excelled in multiple forms of literary expression, earning unmatched fame in the process.

KEYWORDS: Humanistic Author, Horrors of War, Evolutionary Stages, Purposefulness, Class Exploitation

جب پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو احمد ندیم قاسمی کی عمر صرف دو سال تھی۔ ندیم نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے ارد گرد جنگ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال سے بالواسطہ اثر قبول کیا۔ انگریز نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہندوستان خصوصاً پنجاب کو تعلیم و ترقی سے دور رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ انگریز کی نظر یہاں کی زرخیز زمینوں اور تنومند نوجوانوں پر تھی۔ جہلم ،میانوالی، خوشاب، اٹک، راولپنڈی، چکوال اور گجرات کے علاقوں میں زمین انتہائی کم زرخیز ہونے کے باوجود لگان اور ٹیکس کے ذریعے کسانوں کو مزید مفلوک الحال کر دیا گیا تھا۔ اس سرزمین کے باشندوں کے پاس دو ہی راستے تھے بھوک سے مریں یا فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ نتیجتاً بہت سے نوجوان گھر والوں سے پوچھے بتائے بغیر ہی فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے، تاکہ اپنے گھر والوں کو فاقوں سے بچا سکیں۔ انگریز نے زبردستی فوجی بھرتی بھی جاری رکھی۔ جہاں کہیں لوگوں نے فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کیا تو ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا گیا۔ فتح محمد ملک بیان کرتے ہیں:

> "انگریز نے جبری بھرتی کی مہم کے دوران پنجاب کے دیہات پر جو ظلم توڑے ان کا اندازہ جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام کے ذمہ دار سر مائیکل ایڈوائر کے الفاظ سے ہو سکتا ہے کہ پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ چاہئیں اگر خوشی سے نہیں بھرتی ہوں گے تو ہم جبری بھرتی کریں گے"(۱)

ندیم کا علاقہ وادی سون سکیسر فوجی بھرتی کے لیے مشہور رہا ہے۔ نائب صوبیدار سے لے کر میجر، کرنل اور بریگیڈئیر تک ہر دوسرے تیسرے گھر میں موجود ہیں۔ پنجابیوں کا خون ٹکوں کے عوض فرانس اور بیلجئیم کے محاذوں پر بے دریغ بہایا گیا۔ انگریز سرکار نے جبراً پنجاب سے دو لاکھ رنگروٹ بھرتی کیے۔ جن میں سے کم از کم ایک لاکھ کو ان کی مرضی و منشاء کے برعکس جنگ میں دھکیلا گیا تھا۔ فوجی بھرتی کی سدا بہار فصل ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ نوجوان نسل سے یکسر محروم ہو کر رہ گیا تھا۔ مانگیں بگڑتی رہیں سہاگ کی چوڑیاں ٹوٹتی رہیں اور معصوم بچے یتیم ہوتے رہے۔ اس علاقے کی انہی فوجی خدمات کے سلسلے میں انگریز اسے سلطنتِ ہند کا "بازوِ شمشیر زن" کہتا رہا۔ اور غیر سرکاری طور پر اسے مارشل سٹیٹ کا درجہ دیا گیا۔ انگریز حکومت یہ سب کچھ اپنے مقاصد کے لیے کرتی رہی۔ اور معصوم نوجوان جنگ کی بھینٹ چڑھتے رہے۔

بقول فتح محمد ملک:

> "قدرتی طور پر ندیم نے مقامی غریب اور غیور کسانوں اور بیرونی جابر حکمرانوں کے درمیان تصادم کی کہانیوں کے طلسم اور ان لوک گیتوں کی آنچ میں ہوش سنبھالا جن میں لام باقاعدہ

دیومالائی کردار کا مقام پا چکی تھی۔جنگ ختم ہو گی تب پتہ چلے گا بیوہ کون اور سہاگن
کون"(۲)

ہندوستان پر جنگ کے پڑنے والے اثرات سے انگریز حکومت کو کوئی غرض نہیں تھی۔لیکن فنکار کا دل تو اپنے لوگوں کی سلامتی میں اٹکا ہوتا ہے۔ایک سچا قلمکار کیسے ان حالات سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ندیم کے ہاتھوں میں قلم نے جب پہلی انگڑائی لی تو جنگ کی چڑیل کے چبائے کئی کلیجے ،بے رونق آنکھیں ،زرد چہرے اور مٹی ہوئی شناخت والے رشتوں کو جابجا اپنے گرد بکھرا ہوا پایا۔اگرچہ یہ جنگ ہندوستانیوں کی جنگ نہ تھی۔مگر وہ بے چارے چند ٹکوں کے عوض مرنے یا مارنے کے لیے اس میدان میں اتار دیے گئے تھے۔اور استعمار پسندوں کے عزائم کی تکمیل کے لیے موت کے اس خونی کھیل کا لقمہ بن چکے تھے۔ندیم کا افسانہ "بوڑھا سپاہی" پہلی جنگِ عظیم کے اثرات سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔بوڑھا جنگ کی کہانی سناتے ہوئے کہتا ہے:

"ایک دفعہ میں نے ایک جرمن سپاہی کے دل میں سنگین گھونپ دی۔وہ بے تاب ہو کر گر
پڑا اور بڑی مشکل سے اپنی جیب میں سے بھرے بھرے گالوں اور سنہرے گھنگھریالے
بالوں والی ایک خوبصورت بھولی بھالی لڑکی کی تصویر نکالی،اسے چوما،ہچکی لی اور مر گیا"(۳)

جنگ کا شکار ہونے والوں کے دلوں پر کیسی کیسی قیامتیں برپا ہوتی ہیں۔سپاہیوں کو دورانِ جنگ کیا کیا صعوبتیں جھیلنا پڑتی ہیں۔خوف اور ناامیدی کے جنگل ان کی ذہنی صحت پہ کتنا برا اثر ڈالتے ہیں۔بہت سے سپاہی زخمی ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ذہنی یا جسمانی معذوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ان کی آئندہ کی زندگی موت سے بدتر ہو جاتی ہے۔ان کے اہل خانہ تک ان کے مرنے کی خبر پہنچ جاتی ہے۔ان مصائب کا بہت دلدوز منظر ہمیں "بوڑھا سپاہی" افسانے میں نظر آتا ہے:

"بندوقوں کی گولیاں ہمارے سر کے بالوں کو چھو کر نکل جاتی تھیں۔کئی بار سنگینوں کی نوکوں
نے ہمارے سینوں کو چھوا۔گولیاں ہماری کھال اڑاتی مٹی میں دھنس گئیں۔گرد و غبار
،دھواں اور آگ،ہر طرف چیخیں فریادیں۔"(۴)

ندیم نے جب ہوش سنبھالا تو اس کے ارد گرد ایسی بہت سی تکلیف دہ حقیقتیں موجود تھیں جن میں شہید سپاہیوں کی جوان بیوائیں دھندہ کرنے پر مجبور ہو گئیں۔کچھ برضا و رغبت گھر سے بھاگ گئیں۔اور کچھ نے بچوں کے پیٹ بھرنے کے لیے خود کو کھلونا بنالیا۔ بہنوں اور بیواوں کو تو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ کچھ قرار آجاتا ہے۔مگر ماں باپ اور بال بچے ایک دوسرے کے مدمقابل آجاتے ہیں۔جیسے افسانہ "آتشِ گل" کی "گلابو" جو کہ سپاہی "رمضو" کی بیوہ ہے اور افسانے کا مرکزی کردار بھی

ہے۔ رمضو جنگ میں کام آ گیا ہے۔ اور پنشن رمضو کے باپ کو ملی ہے۔ لیکن گلا بو یہ پنشن اپنے نام کروانا چاہتی ہے۔ رمضو کی پنشن کے جھگڑے نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے اسے ندیم کے لفظوں میں ملاحظہ کیجئے:

"سرکاری رجسٹر میں دو لفظوں کا اندراج ہوتا ہے۔ پنشن کے جھگڑے چلتے ہیں سیاہی کی قیمت چکائی جاتی ہے۔ اس کے والدین اور بیوی بچوں کے درمیان دس یا پندرہ یا بیس روپوں کی ننھی سی دیوار ایک فصیل بن کر ابھرتی ہے اور ان فصیلوں کے رخنوں سے کوئی پیار سے نہیں جھانکتا۔ یہاں سے ایک دوسرے کی طرف صرف گالیاں منتقل کی جاتی ہیں۔ اور ماں باپ کے ہاتھوں میں رعشہ آ جاتا ہے۔ اور بیواؤں کے چہروں پر سرسوں پھولتی ہے۔"(۵)

جنگ میں کام آ جانے والے تو جینے کے جھنجھٹ سے ہی چھوٹ گئے۔ مگر پیچھے رہ جانے والے جو غربت کے ساتھ جنگ آزما ہیں۔ روز جیتے اور روز مرتے ہیں۔ انہیں پیٹ کے دوزخ کا سامنا ہے۔ مقدس رشتے نفرتوں کی نظر ہو جاتے ہیں۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے۔ رمضو کا باپ جو کہ نابینا ہے۔ اور اس کا کوئی روزگار بھی نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ رمضو کی پنشن بیوہ کی بجائے اس کو ہی ملتی رہے۔ جب کہ اس کی بہو کا موقف ہے کہ اگر اسے پنشن نہیں ملے گی تو وہ اپنے بچوں کو پالنے کے لیے ناجائز کام کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ بوڑھے حافظ کو بگی پنشن ہر صورت چاہیئے بھلے ااس کے لیے اسے اپنی بہو کی کردار کشی بھی کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی بہو کے بارے میں مصنف کو بتاتا ہے:

"تم میرے رمضو کی پنشن اس حرامزادی کے نام لگوانا چاہتے ہو۔ جس نے تین بچے جنے ہیں تو دس نکلوائے ہیں۔ بیٹا تم اس کے لیے چٹھیاں نہ لکھا کرو۔ یہ پندرہ روپے رمضو کے ماں باپ کے لیے رہنے دو۔ اس کی گھر والی تو خود بڑی کماؤ ہے۔"(٦)

ندیم کے افسانوں کا بغور مطالعہ بتاتا ہے کہ جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ مگر اپنے پیچھے مسائل کا لامتناہی سلسلہ چھوڑ جاتی ہے۔ جنگ کے دیے ہوئے زخم کئی نسلیں سہلاتی ہیں۔ جنگوں کے نتیجے میں ہونے والی تباہی اور اس کے اثرات جلد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ فتح محمد ملک لکھتے ہیں:

"جنگ و امن کے موضوع پر احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے اردو افسانے کی پوری تاریخ میں لاثانی ہیں۔ یوں تو امن اور انسانیت کی پرستش ترقی پسند نظریہ ادب کا نمایاں ترین تصور ہے۔ مگر جنگ کے ہلاکت خیز تجربے سے جس دلسوزی کے ساتھ ندیم تخلیقی زرخیزی اخذ کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کی مثال اردو فکشن میں نایاب ہے۔"(۷)

جنگ کے دوران اپنے ساتھیوں کو مرتے دیکھنا۔موت کے سائے میں جینا، آہ و بکا سننا ہر وقت کا اعصابی تناو، جیتے جاگتے دوستوں کو لاش کی صورت میں دیکھنا اور وہیں چھوڑ کر آگے بڑھنا کوئی معمولی باتیں نہیں ہیں گنجان جھنڈوں سے گولیوں کی بوچھاڑ کسی بھی وقت کسی بھی سپاہی کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی تھی۔جو بھی سپاہی لقمہ اجل بن جاتا تھا اس کے ساتھیوں کے پاس چند لمحے بھی نہیں ہوتے تھے کہ اس کی موت پر اپنے غم کا اظہار کر سکیں۔ جیسے کہ "آتشِ گل "میں رمضو کی موت کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

"رمضو منہ کے بل زمین سے چمٹا رہ گیا۔اور جب اس کے ساتھی نے رمضو کے قریب جا کر اسے پکارا تو اور اس کا سر اٹھایا تو وہ مر چکا تھا۔اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔اور لہو کے چند قطرے اس کی ناک سے پھوٹ کر مونچھوں کی جڑوں میں جمع ہو رہے تھے۔"(۸)

جنگ میں مارے جانے والے سپاہی کی پنشن کے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔جب یہ مسئلہ کسی صورت نہیں نپٹ رہا تو مشورے کیے جاتے ہیں کہ کیوں نہ پنشن آدھی آدھی کر لی جائے۔ایک حصہ رمضو کے والدین کے لیے اور دوسرا رمضو کے بیوی بچوں کے لیے۔مصنف کا حساس دل اس بات کا اثر ایسے محسوس کرتا ہے کہ:

"میرے سامنے اچانک رمضو کی لاش ابھری ٹھک سے ایک تلوار گری اور رمضو دو ہو کے رہ گیا۔اور پھر جیسے اس کے ایک حصے کو اس کے اس کے ماں باپ گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔ اور دوسرے حصے سے اس کی بیوی اور بچے چمٹے چلے گئے تھے۔اور اب میرے سامنے جمے ہوئے خون کے ایک دائرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔"(۹)

"ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد" جنگ کے موضوع پر لکھا گیا ایک شاہکار افسانہ ہے۔ہنستے بستے گھروں کا اجڑنا، بچوں کا یتیم ہو جانا، وفاوں کا بدل جانا، رشتوں کا اپنی قدر و قیمت کھو دینا، وقت کا یکسر پلٹ جانا اس افسانے میں نظر آتا ہے۔افسانے کا بوڑھا کردار "شہباز دادا" جو بظاہر بہت ہنس مکھ اور ہر بات کو مذاق میں ٹال دینے والا نظر آتا ہے وہ اندر سے بالکل مختلف ہے۔وہ پہلی جنگِ عظیم میں شرکت کر چکا ہے اور اس کے خوفناک مناظر کچھ یوں بیان کرتا ہے:

"پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ سینکڑوں جرمنوں کا موت کے گھاٹ اتارا۔سچ کہتا ہوں دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کے رہ گیا۔اندھیری گرجتی دھاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں اور گرا بھی لاشوں پر۔کسی کی انتڑیاں باہر پڑی تھیں، کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا تھا، کسی کی ٹانگیں غائب تھیں"(۱۰)

میدانِ جنگ میں اگر جسمانی اور ذہنی کرب کی صعوبتیں ہیں تو انتظار کرنے والے بھی سولی پہ لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ان کے اندر خوف اور ناامیدی کی جنگ جاری رہتی ہے۔پوری فضا سوگوار نظر آتی ہے۔اس صورتِ حال کی منظر کشی ندیم کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"آہستہ آہستہ گاوں میں سکوت چھاتا گیا مگر اس سکوت میں زندگی کم اور موت زیادہ تھی۔ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں تھیں اور یتیموں کی کراہیں۔کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کٹیلا تھا۔مویشی تک اداس نظر آتے تھے۔ہر جمعرات کو میرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں"(۱۱)

۱۹۳۹ میں جنگِ عظیم دوم کا آغاز ہو گیا۔وائسرائے ہند نے اپنے ایک اعلان میں ہندوستان کو بھی لڑائی کا فریق قرار دے دیا۔اگرچہ یہ جنگ ہندوستان تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر بھینسوں کی لڑائی میں گھاس کے نقصان کے مصداق بہت سے ہندوستانی برما فرنٹ پر مارے گئے۔پرائی آگ میں جھونکنے کے لیے غریب ماؤں کے بیٹے ایندھن بنا دیے گئے۔جو جنگ میں مرتے مارتے تو رہے مگر ساتھ میں انہیں یہ احساس بھی ستاتا رہا کہ وہ ناحق مر رہے ہیں اور ناحق مار رہے ہیں۔ جیسے کہ جنگ سے زندہ لوٹ آنے والے شہباز دادا کے یہ الفاظ:

"میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی۔یہ سات ٹھیکریاں،یہ سات لعنتیں،شہباز دادا کی آواز بھرا گئی اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال سے اتر گیا۔(۱۲)

جنگ میں شمولیت کے خلاف خوب جلسے جلوس بھی کیے گئے۔جمعیت علمائے ہند نے فوج کی ملازمت پر "حرام"کا فتویٰ بھی دیا۔ نیز اس طرح کے اعتراضات بھی سامنے آتے رہے کہ بم کا وہ حصہ جسے منھ میں ڈال کے پن اکھاڑی جاتی ہے وہاں سؤر کی چربی لگی ہوتی ہے۔پنجابیوں میں جنگ کے خلاف جوش و جذبہ دیکھتے ہوئے حکومتِ ہند کے سیکرٹری دفاع نے ۱۵اگست کو مسودہ قانون پیش کیا اور پنجاب بھر میں فوجی بھرتی کی مخالفت کو جرم قرار دے دیا جس کی سزا دو سال قیدِ بامشقت ٹھہری۔ یہ دستورِ زباں بندی عوام کو نئی مشکل میں ڈال گیا۔"ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد"افسانے کا ایک کردار پٹواری شمشیر خان سے کہتا ہے:

"یہ جنگ کہاں نہیں ہو رہی چچا جنگ صرف توپ بندوق کی محتاج نہیں بھوک کی بھی جنگ ہوتی ہے۔غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے۔انتظار کی بھی جنگ ہوتی ہے۔یہ جنگ ہر جگہ ہو رہی

ہے۔"(۱۳)

ندیم بخوبی جانتے ہیں کہ جنگ نقارہ اجل ہے۔کسی کی استعمار پسندی کے لیے معصوم جانوں کا نقصان نتیجتاً معصوم خاندانوں کی تباہی ایک فنکار کو کے لیے کیسے قابلِ برداشت ہو سکتی ہے۔ندیم کو رہ رہ کے جنگ کے وہ اثرات ستاتے ہیں جنہوں نے دیہات کو اجاڑ دیا۔اور دیہاتیوں کی زندگیوں میں دکھ بکھیر دیے۔مائیں، بہنیں، بیویاں، بیٹیاں اور معصوم بچے جو جنگی قیدیوں اور سپاہیوں کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں ان کے لیے مایوس کن خبریں فرسانِ روح بنی ہوئی ہیں:

"تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی رہی ہو وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں۔ان کے ذہن مر چکے ہیں۔ان کے جسم مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں۔ان کے عقیدے مر چکے ہیں۔ان کے جسم شاید واپس آجائیں مگر وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے۔(۱۴)

افسانہ "ہیرا" کے وریام کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔بانکا سجیلا، صحت مند نوجوان جب جنگ کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا واپس آیا تو نفسیاتی مریض بن چکا ہے۔اکثر اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے، چیخنے چلانے لگتا ہے، خود کو میدانِ جنگ میں محسوس کرنے لگتا ہے۔درحقیقت میدانِ جنگ میں ایسے ایسے خوفناک مناظر دیکھ آیا ہے کہ جب بھی ذرا سی کوئی بات خلافِ طبیعت ہو جاتی ہے تو بھڑک اٹھتا ہے۔اس کی بیوی بہت دلجوئی کرتی ہے۔مگر بے سود۔وریام کی اس حالت کا سبب وہ خوفناک مناظر ہیں جن میں وریام نے اپنے ساتھیوں کو اذیت ناک موت مرتے دیکھا ہے وریام نے اپنے ایک دوست نواز کی موت اس طرح دیکھی ہے کہ اس کا سارا جسم قیمہ ہو چکا تھا اور سر دوسری طرف کٹا پڑا تھا:وریام کو اس کی لاش میں اپنا بیٹا دکھائی دے رہا ہے۔اور کبھی اسے لگتا ہے کہ یہ اس کے دوست کی نہیں بلکہ اس کی خود کی لاش ہے۔وہ اس اذیت کو بار بار محسوس کرتا ہے۔

"میرے اندر کسی چیز نے میری بوٹی بوٹی کاٹنی شروع کر دی۔بھئی مجھے بہرام کی قسم، زینو مجھے تمھاری قسم، مجھے خدا کی قسم ہے کہ اس وقت مجھے اپنے گوشت میں سے گزرتی چھری کی چر چر کی آواز بھی سنائی دے گئی۔بس اس کے بعد مجھے ہسپتال لے گئے۔سنا ہے تب سے میں بکتا جھکتا رہتا ہوں۔اور بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔اور بھاگتے بھاگتے زمین پر دھپ سے لیٹ جاتا ہوں۔"(۱۵)

نہ جانے کتنے ہی وریام اپنی صحت، جوانی اور ذہنی توازن جنگ کی بھٹی میں جھونک آئے۔محض چند ٹکوں کے عوض کتنے

ہی وریام پاگل ہو گئے۔ کتنے ہی بہرام اور زینو مصیبتوں میں گھر گئے۔وریام چونکہ کسی کام کاج لے لائق نہیں رہا اس لیے زینو لوگوں کے گھروں میں جھاڑو پونچھا کر کے گزارا کر رہی ہے۔وریام کو خبر ہی نہیں کہ روٹی کہاں سے مل رہی ہے۔بہرام کے جوتے کپڑے کا انتظام کیسے ہو رہا ہے۔جب وریام کو پتہ چلتا ہے کہ آج کل وہ بھیک اور خدا ترسی پر پل رہا ہے تو وہ خود کمانے کا تہیہ کر لیتا ہے:

"آج سے میں کام کروں گا زینو!چاہے مجھے سائیسی ہی کیوں نہ کرنی پڑے،پر زینو میں بہرام
کو حلال کی کمائی کھلاؤں گا۔(۱۶)

وریام کے تھکے ہوئے اور حساس ذہن پر ایک تازیانہ تب لگتا ہے جب ملکانی کی طرف سے میراثن کے ہاتھ پیغام آتا ہے کہ بچا ہوا گوشت آ کے لے جاو۔وریام وہ گوشت کتوں کو ڈال دینے کی تجویز پیش کرتا ہے تو پیراثن یہ راز فاش کرتی ہے کہ غریب آدمی بھی کتا ہی ہوتا ہے۔زینو صورتِ حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتی ہے مگر وریام یہ تذلیل برداشت نہیں کر پاتا اور زینو جب کام کاج کے لیے نکلتی ہے تو وہ خودکشی کر لیتا ہے:

"وہ بہرام کو سینے سے چمٹا کر ڈراونی چیخیں مارتی ہوئی بھاگی مگر وہ پلیٹ فارم پر دیر سے پہنچی تھی
اس وقت قلی گاڑی کے پہیوں سے وریام کے چھڑے کو الگ کر کے بیلچوں کے سہارے
کھڑے چپ چاپ رو رہے تھے۔(۱۷)

جنگ کے متعلق لکھے گئے تمام افسانوں میں ندیم کے اندر کا داعی امن بار بار پکارتا اور دہائی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔دو جنگوں کے اثرات دیکھ چکنے کے بعد وہ کسی تیسری جنگ کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔وہ کسانوں کو پر سکون اور خوشحال دیکھنا چاہتے ہیں۔یہاں ان کی فکر عالمگیر ہو جاتی ہے۔محبت کرنے والے معصوم بھولے بھالے سپاہی جاپان کے ہوں یا ہندوستان کے ،ندیم کو دونوں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ندیم جنگ کو ظلم،بربریت اور جبر کا نام دیتے ہیں۔"ہیروشیما سے پہلے ہیروشیما کے بعد"کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"جنگ جو کبھی ختم نہ ہو گی یہ جنگ جو دریا سے نہریں نکالتی ہے۔جو سبز کھیتوں میں سڑکیں
نکالتی ہے۔تم روز جنگ جنگ پکارتے ہو جنگ ہر جگہ جاری ہے۔ہماری زندگی خود ایک جنگ
ہے۔"(۱۸)

انگریز کی سخت معاشی پالیسیاں حد سے بڑھے ہوئے لگان اور ٹیکس چھوٹے کسانوں کا معاشی قتل کر رہے تھے۔اور

پنجاب میں غربت و افلاس نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ایسے میں جبری بھرتی نے پنجاب کے دیہات نوجوانوں سے خالی کر دیے۔ جب جاپان بھی جنگ میں کود پڑا اور سنگاپور اور برما پر قبضہ کر لیا۔ ایسے میں انگریز سرکار کو پنجاب کے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ غیر جنگجو عانہ اقوام کو بھی فوج میں بھرتی کرنا پڑا۔ ایسے نوجوان بھی بھرتی کر لیے گئے جو کسی طور سپاہی کہلوانے کے لائق نہیں تھے۔ "مامتا" افسانہ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"فوجی بھرتی میں کئی بار منھ کی کھائی ہے مگر اب کہ ڈاکٹر نے میری باہر نکلی ہوئی پسلیوں سے نظر بچاتے ہوئے میرے لمبے قد کی تعریف کی۔ اور کہا کہ اتنے دراز قد سپاہی کو دیکھتے ہی چینی بالشتیے دہل کر مر جائیں گے۔ ہانگ کانگ پولیس میں چھ فٹ سے کم قد کے نوجوان کو بھیجنا بہت بڑی سیاسی غلطی ہے۔ اور اس سیاسی غلطی کی تصحیح کا جذبہ مجھے ہانگ کانگ لے آیا۔"(۱۹)

افسانہ مامتا کا متکلم کردار جاپانی فوج کا قیدی بن گیا۔ جنگی قیدی کی زندگی کتنی بھیانک ہوتی ہے۔ اس کی کچھ جھلکیاں ہمیں اس افسانے میں نظر آتی ہیں۔ جنگی قیدیوں کو تکلیف دینا انہیں بے رحمانہ موت مارنا جاپانی فوجیوں کے لیے مذاق اور دل لگی ہے۔ جاپانی فوجی ایک ایک گولی سے دو دو قیدیوں کی جان لے لیتے ہیں۔ ان کی کربناک موت پر بے تحاشہ ہنستے ہیں:

"گولی سربلند کے جسم سے نکل کر اس کے پیچھے کھڑے وارث کے پیٹ میں گھس گئی۔ سربلند پیچھے گرا تھا تو وارث منھ کے بل گرا تھا۔ اور موت کے کرب میں دونوں نے ایک دوسرے کے منھ نوچ ڈالے اور وارث کی موت جاپانیوں کے لیے لطیفہ بن گئی تھی۔"(۲۰)

افسوس صد افسوس کہ جنگ میں شریک ہونے والوں کی اکثریت غریبی اور بے روزگاری سے تنگ ہونے کے علاوہ ناتجربہ کار اور جنگی تربیت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ وہ غریب کسانوں کے بیٹے اپنے دیہات سے نکل کر مختلف ممالک کے جنگلوں اور صحراؤں میں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ جہاں موت مسلسل ان کے تعاقب میں پھرتی ہے۔ جنگ کا حصہ بننے سے پہلے بھوک مسلسل سروں پر منڈلاتی تھی:

"فوجی بھرتی میں اس شدت کی کشش تھی کہ وہ نوجوان جو اپنے کھیتوں کے تنہار کھوالے تھے۔ نلائی کے بہانے گھروں سے نکلے اور ہلوں اور بیلوں کو کھیتوں میں چھوڑ کر فرار ہو گئے۔ ہفتوں کے بعد سکندر آباد یا لکھنو سے ان کی چٹھیاں آئیں کہ وہ ماں باپ اور بہن بھائیوں کو فاقوں سے مرتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں۔"(۲۱)

افسانہ "السلام علیکم" کی فضا بھی جنگ کی سوگواریت سے بھری ہوئی ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار امیر خان جنگ کے زمانے میں گھر سے دور رہا۔ اور وہاں مس لیوسی کے گھر دادِ عیش دیتا رہا۔ جوان بیوی اور بچہ ہندوستان کے ایک گاوں میں بے آسرا رہے۔ کریم خان دوماہ کی چھٹی لے کر اپنے عزیزوں کو بتائے بغیر آرہاہے۔اسے بار بار لیوسی یاد آرہی ہے۔اور اسے اپنے کیے پر افسوس بھی ہے۔ مگر وہ اس بات پر مطمئن ہے کہ لیوسی کے راز سے اس کے اور لیوسی کے علاوہ کوئی اور واقف نہیں۔ کریم خان جب کپڑے ، مٹھائی ، پھل اور گزشتہ تین سال کی تنخواہ لے کر گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں کسی اور مرد کو موجود پاتا ہے۔ یہاں قاری محسوس کرتا ہے کہ جنگ میں ہر طرح کا کرب جھیل کر زندہ لوٹ آنے والے کو گھروں میں کیا کیا دیکھنا پڑتا ہے۔ان کے سینوں میں دبی امنگوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ان کی خوشیاں غموں میں بدل جاتی ہیں ۔ تین سال تک مورچوں ،خندقوں اور جھاڑیوں میں بھوک پیاس سہتے ہوئے کھوپڑیاں اور لاشیں دیکھ دیکھ کر جب وہ پاگل ہونے لگتا تو اپنے گاؤں کو یاد کرنے لگ جاتا۔ اپنے بیوی بچوں کو یاد کرکے خوش ہو جاتا کہ دنیا میں وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ یہ دو ہستیاں اس کے ساتھ ہیں۔ کبھی بگڑی ہوئی بدبودار لاشوں کا دیکھتا تو ڈر جاتا کہ معلوم نہیں کبھی گھر جانا نصیب بھی ہو گا یا ان لاشوں جیسا ہی انجام ہو گا۔ قسمت کی مہربانی سے کریم خان کو گھر جانا نصیب ہوا تو آگے کا منظر اس کے لیے فرسانِ روح تھا:

> " جمائی کی ایک اونچی آواز آئی۔ امیر خان نے کوٹھڑی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم ہوا جیسے دروازہ ابھی تک منھ کھولے جمائی لے رہاہے۔ اس نے تین برس کے شور و غل میں اپنی سماعت پر زور دے کر کچھ سننا چاہا۔ ایک پتلی دبی دبی آواز آئی، جاودن چڑھ آیا ہے۔ مرغ کب کے بانگیں دے چکے۔ جاو۔۔"(۲۳)

جنگ میں لاپتہ ہو جانے والوں کی بیویوں کی حالت بیواوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ یہ مائیں اپنے بچوں کو بھوک سے بچانے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی غلط راستوں پر چل پڑتی ہیں۔ جن کے شوہر ان کے پاس ہیں اگرچہ وریام جیسے نفسیاتی مریض ہی ہوں۔ وہ تو برتن مانجھ کر بھی گزارہ کر لیتی ہیں۔ لیکن جن کے شوہر مارے جاتے ہیں یا لاپتہ ہو جاتے ہیں جیسے کہ رمضو کی بیوی دھندہ کرنے پر مجبور ہے۔ اور کریم خان کی بیوی بھی اپنے بچے کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کسی اور سے راہ ورسم بڑھانے پر مجبور ہے۔ اگرچہ اس کا دل اس فعل پہ مطمئن نہیں ہے۔ وہ اپنے بچے میں اپنے شوہر کو دیکھتی اور محسوس کرتی ہے۔ بہت سے بوڑھے ماں باپ اپنے جوان بیٹوں کی واپسی کے منتظر ہیں۔ جن میں سے کچھ کو تو خبر بھی مل چکی ہے کہ ان کے بیٹے اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی ڈاکخانوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں کہ شائد ان کے بیٹوں کی چٹھی آئی ہو۔ کچھ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں

مگر اپنے بیٹوں کو نہیں بھولے۔ایسے بزرگ ساری زندگی اپنے بیٹوں کی چھٹیوں کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔جنگ کے موضوع پر لکھے گئے ندیم کے افسانے بظاہر چند کرداروں، چند خاندانوں یا چند دیہات کے گرد گھومتے ہیں۔لیکن در حقیقت یہ پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔ندیم کا قلم نہایت مہارت اور کامیابی سے جنگ کی ہولناکیوں اور اس کے اثرات کی تصویر کھینچ کے قاری کے سامنے رکھ دیتا ہے۔:

> "زندگی جیسے پاؤں گھسیٹتی پھر رہی تھی۔ماری ماری خانماں برباد اور پریشان حال، گھومتی اور چکراتی ہوئی، اونچی لگروں پر رکتی اور گہری کھائیوں میں لٹکتی ہوئی. اور سریلے بولوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا۔اور جنگ جاری تھی ۔عوام کی جنگ۔جمہوریت کی جنگ۔نوعِ انسان کی آزادی کی جنگ"(۲۴)

احمد ندیم قاسمی کے جنگ کے تناظر میں لکھے گئے افسانے آدمیت کا نوحہ محسوس ہوتے ہیں۔جنگ ظلم و بربریت کی داستان ہے۔اور اس داستان کا انجام نہایت بھیانک ہے۔یہاں آہیں ہیں، کراہیں ہیں، تعفن زدہ لاشیں ہیں، کڑکڑاتے ہوئے ڈھانچے ہیں، نفسیاتی امراض ہیں، پیٹ سے باہر ابلی ہوئی انتڑیاں ہیں، یہاں خوف ہے، ناامیدی ہے ، بھوک ہے، پاگل پن ہے، جنون ہے۔دوبڑی جنگوں نے انسانوں کو جدائی، تنہائی، یتیمی، بیوگی، بے راہروی اور دردناک موت کے سوا کیا دیا ہے۔ایسے میں کون صاحبِ دل ہو گا جو جنگ کی حمایت کرے گا۔جنگ مسائل کا حل نہیں ہے بلکہ جنگ توبذاتِ خود ام المسائل ہے۔ندیم جیسا صاحبِ ادراک فنکار انسانی برادری کو بے احتیاج دیکھنا چاہتا ہے۔اس کے قلم نے ہمیشہ محبت کے پھول کھلائے ہیں۔وہ نہیں چاہتا کہ دنیا کو دوبارہ جنگ کا سامنا کرنے پڑے۔

حوالہ جات

۱۔فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار، لاہور:سنگِ میل پبلیکیشنز، ۱۹۹۱ء ص:۱۲۳

۲۔ایضاًص ۱۳

۳-احمد ندیم قاسمی، چوپال، لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء ص:۲۳

۴-ایضاً ۳۴

۵۔احمد ندیم قاسمی، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، لاہور:سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء ص:۶۸۶

۶۔ایضاً ۶۸۸

۷۔ فتح محمد ملک، احمد ندیم قاسمی شاعر اور افسانہ نگار، ص ۱۲۷

۸۔ احمد ندیم قاسمی، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، ص:۱۲۹

۹۔ ایضاًص:۱۸۹

۱۰۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، لاہور: اساطیر ۱۹۹۵ء ص ۸٦

۱۱۔ ایضاًص:۹۴

۱۲۔ ایضاًص:۸۷

۱۳۔ ایضاًص:۸۹

۱۴۔ ایضاًص:۹۷

۱۵۔ احمد ندیم قاسمی، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، ص:۳۰۹

۱٦۔ ایضاًص:۳۱۴

۱۷۔ ایضاًص:۳۱۸

۱۸۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، ص ۸۹

۱۹۔ احمد ندیم قاسمی، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، ۴۸۹

۲۰۔ ایضاًص:۱۰۷

۲۱۔ احمد ندیم قاسمی، در و دیوار، لاہور: اساطیر، ۱۹۹۵ص:۴۲

۲۲۔ احمد ندیم قاسمی، مجموعہ احمد ندیم قاسمی، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء ص:۴۴۰

۲۳ ایضاًص:۴۴۵

۲۴۔ احمد ندیم قاسمی، آبلے، ص:۹۴